

باوجود ہتھیلی پر جان رکھ کر میدان قتال میں آگئے ہو تو تم نے ثابت کر دیا کہ تم مومن صادق ہو۔ اور جو جان بوجھ کر پیچھے رہ گئے، 'کونوں کھدروں میں چھپ گئے تو معلوم ہو گیا کہ وہ مدعی ایمان ہوا کریں لیکن ان کے دلوں میں ایمان حقیقتہً نہیں ہے۔ وہ منافق ہیں۔ یہ تمیز کیسے ہوتی ہے۔ اگر یہ شکل نہ ہوتی! یہ ابتلاء کا فلسفہ ہے یہ آزمائش کی حکمت ہے۔ اس بات کو یوں بھی سمجھ لیجئے کہ قرآن مجید کہتا ہے کہ یہ دُنیوی زندگی ہے ہی آزمائش کے لئے خَلْقَ الْمَوْتِ وَالْحَيٰوَةِ لِيَبْلُوَكُمْ اَنُكُمُ احْسَنُ عَمَلًا مامہ اقبال مرحوم نے اغلباً اسی آیت کی تعبیر اس شعر میں کی ہے

قلزم ہستی سے تو ابھرا ہے مانندِ حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحان ہے زندگی

ابتلاء کا وہی لفظ یہاں آیا لیبْلُوْا بعضکم ببعض تاکہ اللہ تعالیٰ تم لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ سے آزمائے اس نے مشرکین و کفار کو چھوٹ دی وہ قریباً بارہ برس تک مکہ میں محمدؐ رسول اللہؐ و الَّذِیْنَ مَعَهُ کو ستاتے رہے اللہ تعالیٰ چاہتا تو ابو جہل کا ہاتھ شل کر دیتا اور وہ حضرت سمید رضی اللہ عنہا کو شہید نہ کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ چاہتا تو امیہ ابن خلف کو فالج زدہ کر دیتا اور وہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو کوئی سزہ نہ پہنچا سکتا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے مشرکین کو اہل ایمان پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑنے کی چھوٹ دیئے رکھی۔ کیوں! اس لئے کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ صنف نازک ہونے کے باوجود حضرت سمید کے دل میں کتنا ایمان ہے! لوگوں کے سامنے یہ بات کیسے آتی کہ حضرت بلالؓ کے دل میں اللہ کی توحید پر کتنا پختہ یقین ہے! اور ان کے دل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کتنی محبت ہے! ان کے دل میں یوم آخرت پر کتنا ایمان ہے! خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر پتھروں کی بارش کرنے کی آزادی اللہ نے اہل طائف کو دی تاکہ لوگوں کو علم ہو جائے کہ ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم صبر و ثبات، استقامت، توکل علی اللہ میں کدہ ہمالیہ سے بھی بلند بالا شخصیت ہیں۔ فداوہ امی والی۔ یہ ہے بعض کو بعض کے ذریعہ سے آزمانا۔ یہ ہے وہ نظام جس کے ذریعہ تربیت مقصود ہے۔ یہ جانچ پرکھ کا وہ نظام ہے جو ازل سے اللہ کی حکمت بالغہ نے تمہارے لئے طے کر رکھا ہے تمہیں تو ابھی آزمائش کی بھینوں سے گزار کر کندن بنانا ہے تمہیں تو اسلام کے عالمی غلبہ تک سفر کرنا ہے۔ اب وہ معاملہ نہیں ہو گا کہ آفات ارضی و

منشور اسلام

(۷)

نماز زبانی تکرار نہیں بلکہ ذہنی عمل کا نام ہے

ذکر ایک ذہنی عمل ہے نہ کہ صرف الفاظ کا تکرار اعادہ۔ ذکر کی اصل روح تفکر و تدبر کی وہ داخلی کیفیت ہے جو حسن ازلی کے ساتھ تعلق کی استواری سے پیدا ہوتی ہے۔ اور یہ کیفیت بلا استثناء تسبیح و تحمید، عجز و انکساری، خوف ورجا اور مسرت و اطمینان کے جذبات عالیہ کے ساتھ وقوع پذیر ہوتی ہے۔ اور یہ جذبات یکے بعد دیگرے مثبت کے ذہن میں محبوب حقیقی کے ساتھ اس کے وقتی رجحان اور تعلق کی مناسبت سے آتے جاتے ہیں۔ الفاظ کا زبان سے بار بار ادا کرنا صرف اس لیے ہے تاکہ یہ عاشق کی اس کیفیت کے حصول میں مدد دے اور یہ مدد اس طرح ہوتی ہے کہ یہ الفاظ حسن ازلی کی ان صفات پر ارتکاز تو جہ کا باعث بنتے ہیں جن کا اظہار ان سے ہوتا ہے۔ اگر نماز یا عبادت کا بدنی عمل اس داخلی ذہنی سعی کے ساتھ نہ ہو تو وہ جذبات محبت و عبودیت میں بالیدگی کا باعث نہیں ہو سکتا۔ اگر نماز یا ذکر کا عمل مندرجہ بالا جذبات کے ساتھ ہے تو یہ اس امر کا قطعی ثبوت ہے کہ داخلی کوشش موجود ہے اور محبت کا علم و عرفان ترقی پذیر ہے۔ قرآن مجید مندرجہ ذیل آیات میں اسی حقیقت کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔

وَيَذَّكَّرُ عَنْ رَبِّهِ أَوْ هَاجَاً وَكَانُوا لَنَا خَاشِعِينَ ۝ (الانبیاء: ۹۰)

ترجمہ: ”اور وہ امید و بیم کے ساتھ میں پکارتے تھے اور ہمارے آگے (عجز و نیاز سے) جھکے رہتے تھے۔“

قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ ۝ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ ۝

(المؤمنون: ۱-۲)

ترجمہ: یقیناً (وہ) ایمان لانے والے فلاح پاگئے جو اپنی نماز میں خشوع رکھنے والے ہیں۔
 اَدْعُوا رَبَّكُمْ قَضَرًا وَخُفْيَةً ط (الاعراف: ۵۵)

ترجمہ: اپنے رب کو پکارو، گڑگڑاتے ہوئے اور چپکے چپکے۔
 وَاَدْعُوهُ خَوْفًا وَطَمَعًا ط اِنَّ رَحْمَةَ اللّٰهِ قَرِيبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِينَ
 (الاعراف: ۵۶)

ترجمہ: اور اُسی کو پکارو (اُس کے مذاب سے) ڈرتے ہوئے اور (اس کی رحمت سے) اُمید رکھتے ہوئے۔ بے شک اللہ کی رحمت نیکو کاروں سے قریب ہے۔

خدا سے واقعی محبت رکھنے والا فرد ہمیشہ خوف اور رجا کے بین بن رہتا ہے اس کو خوف اس بات کا رہتا ہے کہ مبادا وہ جذبہ محبت سے تہی دامن ہو کر اپنے محبوب کی ناراضگی مول نہ لے لے۔ اور امید و رجا اس بات کی ہوتی ہے کہ اس کی محبت و سپردگی اسے اپنے محبوب کی نظروں سے پہلے سے زیادہ بلند کرے گی۔ یہی وجہ ہے کہ بغیر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اَلْاِيْمَانُ بَيْنَ الْخَوْفِ وَالرَّجَاءِ -

ترجمہ: ایمان خوف اور اُمید کے درمیان پایا جاتا ہے۔

عبادت گزار کا سب سے بڑا انعام اس کے جذبہ محبت اور نتیجتاً

اس کی شخصیت کا کامل ارتقا ہے

جب محبت خداوندی خلوص اور نکھار کا اعلیٰ ترین مرتبہ حاصل کر لیتی ہے تو اس وقت محبت محبوب کی ناراضگی سے فی نفسہ خائف رہتا ہے۔ اس کا یہ خوف اس منزل یا عقوبت کے ڈر سے نہیں ہوتا جو اس طور واقع ہو سکتی ہے۔ اس کے نزدیک محبوب کی ناراضگی سے بڑی سزا ناقابل تصور ہے۔ اسی طرح وہ محبوب کی پسند اور رضا کا فی نفسہ طلب کار ہوتا ہے نہ اس لیے کہ کسی دوسرے انعام کا باعث بنتا ہے۔ اس کے نزدیک محبوب حقیقی کی پسند اور رضا سے زیادہ بڑا کوئی

انعام نہیں ہے۔ ازرؤ سے قرآن اللہ تعالیٰ کی رضا وہ سب سے بڑا انعام ہوگا جو کسی صاحبِ ایمان کو جنت میں داخل ہوتے ہوئے حاصل ہوگا۔

وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللَّهِ أَكْبَرُ ۚ ذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ (التوبہ: ۷۲)

ترجمہ: اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ کی خوشنودی انہیں حاصل ہوگی یہی بڑی کامیابی ہے۔ یہ انعام اتنا خوش کن اور لذت آگیز ہوگا کہ اس کی کیفیت یا کمیت کا کوئی ہلکا سا اندازہ بھی اس دنیا میں نہیں لگایا جاسکتا۔

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ ۚ جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ۔ (السجدة: ۱۷)

ترجمہ: تو کسی متفکس کو علم نہیں کہ کیسا کیسا انکھوں کی ٹھنڈک (کا سامان) ان کے لیے (فراز) غیب میں (مخفی) ہے۔ یہ ہے صلہ ان کے (نیک) اعمال کا۔

اس متوقع انعام کی نوید جانفزاں سے جنت الفردوس کے دروازے پر ہی سادھی جائیگی۔

يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۖ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۖ فَادْخُلِي فِي عِبَادِي ۖ وَادْخُلِي جَنَّاتِي ۖ (الفجر: ۲۷-۳۰)

”اے نفس مطمئن! چل اپنے رب کی طرف اس حال میں کہ تو اس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی۔ شامل ہو جا میرے (نیک) بندوں میں اور داخل ہو جا میری جنت میں۔“

عبادت کے زندہ عمل کے ساتھ عبدیت، عجز و انکساری اور نفی ذات کے جذبات اس

لیے ہوتے ہیں کہ انسانی خودی اپنے خالق اور معبود کے قریب سے قریب تر ہونا چاہتی ہے

اور یہی صورت حال حسن لازوال پر تدبر و تفکر میں ہوتی ہے۔ یہ جذبات و احساسات محب کے

شعور ذات اور اثبات خودی کے ساتھ متصادم نہیں ہوتے۔ بلکہ درحقیقت یہ انہیں مزید

لقوت پہنچاتے ہیں کیونکہ ذات حقیقی کے ساتھ قرب و اتصال اس میں ایک بے مثال

قوت اور برتری کا احساس اجاگر کرتا ہے۔ محبوب کے حسن اور قدرت کے مقابلے میں وہ اپنے

آپ کو جتنا ہیج اور کم تر خیال کرتا ہے اور جیسے جیسے وہ محبوب حقیقی کی صفات حسن و قدرت کا

عرفان زیادہ سے زیادہ حاصل کرتا ہے، وہ خود اپنی عظمت سے آگہی حاصل کرتا چلا جاتا ہے۔

چنانچہ اس طور محبوب کی صفاتِ حزن سے وہ خود حزنہ پاتا ہے اور اپنی شخصیت میں ان کا انجذاب کرتا ہے۔

باجامعت نماز پانچگانہ (صلوٰۃ)

صاحبِ ایمان لوگوں کا باقاعدہ نظم کے تحت اور اپنے میں سب سے افضل شخص کو امام بنا کر اس کی اقتدار میں پانچ وقت نماز ادا کرنا اقامتِ صلوٰۃ کہلاتا ہے۔ اور یہ ذکر کی سب سے اچھی شکل ہے۔ نماز میں ذکر کی وہ ممکنہ اور کم سے کم مقدار آجاتی ہے جس کی ایک صاحبِ ایمان کے ذوقِ محبت کے اظہار اور اس کی بالیدگی کے لیے ضرورت ہوتی ہے۔ اس سے نہ صرف ذکر کی عادت مستحکم بنیادوں پر قائم ہوتی ہے، بلکہ اس سے اس کے ذوقِ محبت کو بھی وقفوں کے ساتھ تقویت پہنچتی ہے جو اس کے مستقبل میں افزونی کا باعث بنتی ہے۔ نماز کا مقام صاحبِ ایمان لوگوں کی جمعیت میں انتہائی اہمیت کا ہے۔ یہ ان کی پوری عملی زندگی کے لیے محور کا کام کرتی ہے اور ذکر سے معمور زندگی کا عملی نقشہ پیش کرتی ہے۔ تاہم صرف فرض نماز ایک مومن کے ذوقِ محبت کی بالیدگی اور اس کی بلند ترین سطح حاصل کرنے کے لیے کافی نہیں ہے اور اس سے اس سطح پر مطلوب ذکر کی مقدار پوری نہیں ہوتی۔ اور ظاہر ہے کہ روحِ انسانی کا مطمع نظر ترقی کی یہی چوٹی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک سچے مومن کو فرض نمازوں کے علاوہ بھی اپنی روحانی ترقی اور ترفع کے لیے ذکر کے اہتمام کی تاکید کی گئی ہے۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانْتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللَّهِ وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝

”پھر جب نماز ہو چکے تو (تم کو اختیار ہے کہ) زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو اور اللہ کو کثرت سے یاد کرتے رہو تا کہ تم فلاح پاؤ۔“

فَإِذَا قُضِيَتُمْ مَنَاسِكُكُمْ فَادْكُرُوا اللَّهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ أَلَسْتُمْ ذِكْرًا (البقرة: ۲۰۰)

”پھر جب تم اپنے حج کے ارکان پورے کر چکو تو جس طرح تم اپنے باپ دادوں کے

ذکر میں لگ جاتے تھے اس طرح اب اللہ کا ذکر کرو بلکہ اس سے بھی بڑھ کر :-
 تَذِیْنِ یَذْکُرْ وَنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَقَعُودًا ۚ وَ عَلٰی جُنُوبِهِمْ
 (ال عمران: ۱۹۰)

”جو اٹھتے، بیٹھتے اور لیٹتے، ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں۔“
 حسن ازل کے ساتھ رشتہ محبت ایک عجیب لذت، انبساط اور اطمینان کا باعث بنتا ہے
 اور جوں جوں ذوق محبت ذکر و فکر کے ساتھ بڑھتا ہے یہ انبساط و اطمینان بھی بڑھتا چلا جاتا ہے۔
 اور یہ صرف یہ کہ کسی صاحب ایمان کے لقیں میں اضافے کا باعث بنتا ہے، بلکہ اس کی
 حیثیت ایک گہرے ذاتی تجربے کی ہوتی ہے۔ یہ ذاتی تجربہ اس کو اپنے ہدف کا علم اور اس
 کی درستی کا پتہ بھی دیتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ صاحب ایمان کے لیے امید اور اعتماد
 کی ایک بنیاد فراہم کرتا ہے۔ اور مقصد اعلیٰ کے حصول میں کوشش کو ابھارتا اور منضبط کرتا ہے
 بغضائے آیت قرآنیہ:

الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمِیْنُ قُلُوْبُهُمْ بِذِکْرِ اللّٰهِ اٰلَیْہِ الذِّکْرُ اللّٰہِ
 تَطْمِیْنُ الْقُلُوْبُ۔ (الزبد: ۲۸)

”ایسے ہی لوگ ہیں جو ایمان لائے ہیں اور ان کے دل اللہ کی یاد سے مطمئن ہوتے
 ہیں۔ یاد رکھو، اللہ کی یاد ہی سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوا کرتا ہے۔“

ذکر سے جو غیر معمولی اور مخصوص اطمینان ایک شخص کو حاصل ہوتا ہے وہ بجائے خود اس
 امر کا ثبوت ہے کہ ذکر فطرت انسانی کی اہم ترین ضرورت اور داعیے کو پورا کرتا ہے۔ ہم جانتے
 ہیں کہ فطرت کا نظام ہی کچھ ایسا ہے کہ ہر فطری خواہش خواہ اس کا تعلق حیاتیاتی سطح سے ہو یا
 نفسیاتی سطح سے، جب پوری ہوتی ہے تو اس کے نتیجے کے طور پر آسودگی اور خوشی حاصل ہوتی
 ہے۔ اور اسی خوشی اور آسودگی سے اس خواہش یا داعیے کی تکمیل کی جہت کا تعین ہوتا ہے۔

اخلاقی کردار۔ خارجی عمل میں حسن کا اظہار

صحیح نصب العین جس خارجی عمل کو ابھارتا ہے، وہ صفات حسن کا اپنے تئیں اور دوسروں

کے ساتھ برتاؤ میں اظہارِ پُرسش ملتا ہے۔ عام طور پر اسے اخلاقی عمل کا نام دیا جاتا ہے۔ نصب العین کی طرح صحیح مذہبی نصب العین کا بھی ایک اپنا اخلاقی قانون ہوتا ہے جو فرد کے ہر عمل کی نوعیت اور قدر و قیمت کا تعین کرتا ہے۔ چونکہ یہ قانون صفاتِ حسن سے اپنا جواز فرم کرتے ہیں، چنانچہ جو فرد بھی ان قوانین کی پابندی کرتا ہے اس کا عمل بھی صفاتِ عالیہ کا مظہر ہوتا ہے۔ یہ امر مسلم ہے کہ جو شخص کسی نصب العین کو اپناتا ہے اور اس سے محبت کرتا ہے وہ اپنی محبت کا اظہار ہر ممکن عمل میں کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو کوئی صحیح دینی نصب العین سے محبت کرتا ہے وہ اس کا اظہار نہ صرف حسنِ لازوال پر اتر کا زور سے کرتا ہے بلکہ اپنا پورا عمل بھی اسی کے مطابق کر لیتا ہے۔ اس کے شب و روز اور اس کا پورا کردار عمل اس کے عین مطابق ہو جاتے ہیں:

قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ
رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ لَا شَرِيكَ لَهُ ۚ وَبِذَلِكَ أُمِرْتُ
وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ ۝ (الانعام: ۱۶۳، ۱۶۴)

”کہو، میری نماز، میری قربانی، میرا جینا اور میرا مرنا، سب کچھ اللہ ربِّ العالمین کے لیے ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور سب سے پہلے مراعات جھکانے والا میں ہوں۔“

محبتِ حسن اور اخلاقی عمل کو علیحدہ نہیں کیا جاسکتا

اگر ایک مدعیِ ایمان اپنے عمل میں اللہ تعالیٰ کی صفاتِ حسنہ کا اظہار نہیں کرتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اپنے خالقِ حقیقی کی صفات اور حسن کا کوئی ادراک حاصل نہیں کیا اور نہ ہی اُسے اس سے محبت ہے۔ کیونکہ یہ ناقابلِ تصور ہے کہ ایک شخص اللہ کی صفاتِ حسنہ مثلاً حسن، انصاف، حق، خیر، محبت وغیرہ سے متاثر ہو لیکن اپنے عمل میں ان کا اظہار قطعاً نہ کرے یعنی وہ انصاف کی بجائے ظلم، محبت کی بجائے نفرت و تشدد اور حق کی بجائے باطل کا اظہار کرے۔ اگر وہ اپنے دعویٰ محبت میں سچا اور مخلص ہے تو تمام اندرونی اور بیرونی مشکلات

اور بالغ کے علی الرغم اللہ تعالیٰ کی صفاتِ حزن کے سانچے میں اپنے عمل کو ڈھالنے کی حتی المقدور کوشش کرتا ہے۔ اور اس سعی و جہد میں وہ صفاتِ حزن کے شعور کو زیادہ سے زیادہ حاصل کرتا۔ اپنے ذوقِ محبت کو بڑھاتا اور خود آگہی کی بلند تر منزل حاصل کرتا چلا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ ذوقِ محبت کا جب تک عمل سے تعلق رہتا ہے اُس کی شدت میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اور جو نہی وہ عمل سے جدا ہو کر شعوری سطح سے نیچے گرتا ہے، اس کی شدت میں کمزوری واقع ہو جاتی ہے۔

جو شخص ایک باریک اور راست عمل کرتا ہے اس کا دوبارہ کرنا اُس کے لیے نسبتاً آسان ہو جاتا ہے۔ ایک ایسا شخص جس میں ظلم و تعدی عادتاً موجود ہو جب ایک بار شعوری طور پر مشفق و کریم ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ تو یہی عمل بار بار کرنے پر اس کے لیے آسان سے آسان تر ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ اُس کے ذوقِ محبت کی صحیح رُخ میں نشوونما ہے۔ ایک غلط عمل کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ ایک بار صراطِ مستقیم سے انحراف کر کے جب ایک شخص غلط کام کا ارتکاب کرتا ہے تو اُس کے لیے صراطِ مستقیم پر مراجعت مشکل تر ہو جاتی ہے، کیونکہ اس کے ذوقِ محبت میں کمی اور اضمحلال واقع ہو جاتا ہے۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ ہماری خود آگہی اور ذوقِ محبت کا ارتقاء کاملہ ہمارے اعمال کی اخلاقی نوعیت پر منحصر ہے۔ ایک ایسا فرد جو حسن ازل کی پہچان کے بعد اس سے تعلق کا اظہار صرف ذکر و فکر کی شکل میں کرتا ہے لیکن اپنے روزمرہ کے افعال و اعمال میں اس کا اظہار نہیں کرتا، خود آگہی اور عرفان ذات کے اعلیٰ مدارج حاصل نہیں کر سکتا۔ بلکہ احتمال اس بات کا بھی ہے کہ اس کا ذوقِ محبت کم ہو جائے کیونکہ صرف گیان دھیان سے وہ اسے جتنا مستحکم کرتا ہے، اپنی بے عملی کے نتیجے میں وہ اُسے اس سے زیادہ کمزور کر دیتا ہے اور یہ طرزِ عمل یقینی طور پر گھٹائے کا سودا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص صبح کے وقت دو گھنٹے اپنے ہف کی طرف صحیح راستے پر چلے، لیکن دن کا باقی حصہ بالکل مخالف سمت میں چلتا رہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا شخص کبھی بھی اپنی منزلِ مقصود پر نہیں پہنچ سکتا بلکہ اس سے دُور ہی ہٹتا چلا جائے گا۔

اخلاقی عمل کیونکر رفتہ رفتہ آسان تر ہو جاتا ہے

جب کوئی محب صحیح نصب العین سے محبت کرنا شروع کرتا ہے تو آغاز میں اُس کا جذبہ محبت کمزور ہوتا ہے چنانچہ اس نصب العین کے اخلاقی قانون کی پیروی میں بھی کوتاہی اور نقص رہ جاتا ہے۔ مکمل اور ہر نقص سے پاک پیروی ارتقاء خودی کی بلند سطح پر ہی ممکن ہے۔ جب تک محب یا سالک اُس منزل تک نہیں پہنچ جاتا، انتہائی کوشش کے باوجود وہ اکثر غلطیوں اور غامیوں کا مرتکب ہوتا رہتا ہے۔ لیکن جب نماز اور دوسرے اذکار کا باقاعدہ اہتمام کر کے وہ جن لازوال سے اپنا رشتہ محبت مضبوط کر لیتا ہے اور اپنے نفس کے اندھے داعیات پر کنٹرول حاصل کر لیتا ہے تو اس کے لیے جملہ اخلاقی قوانین پر کاربند ہونا آسان تر ہو جاتا ہے۔ اس کا عمل غامیوں سے مبرا اور اخلاقی اعتبار سے اعلیٰ تر ہوتا چلا جاتا ہے اور جن مطلق کی صفات حمیدہ سے اُس کی ہم آہنگی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اس سطح پر اخلاقی عمل حسن پر ارتکاز تو بہ مزید ممکن بنا کر فرد کو اعلیٰ تر سطح کی خود نشو و نما اور ادراک ذات بہم پہنچاتا ہے۔ حسن مطلق کی زیادہ بہتر معرفت اور معیت پا کر جب ایک صاحب ایمان اپنے مشغولات ذکر و فکر کی طرف لوٹتا ہے تو وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ اب ان میں پہلے سے کہیں زیادہ ارتکاز تو جہ کر سکتا ہے اور اس طرح وہ ان سے اطمینان و انبساط بھی زیادہ حاصل کرتا ہے۔ حسن مطلق کا یہ مراقبہ کس کے جذبہ عشق کو ہمیز دیتا ہے اور زندگی کے شب و روز میں اخلاقی قانون کی بجائے اُن کو عمل بن دیتا ہے۔ اس طرح مراقبہ (یعنی ذکر و فکر) اور اخلاقی عمل باہم دگر لازم و ملزوم ہیں اور دونوں مل کر فرد کو ادراک ذات کے اعلیٰ تر مقام پر لے جاتے ہیں حتیٰ کہ وہ ارتقاء جذبہ محبت کی اعلیٰ ترین منزل تک رسائی حاصل کر لیتا ہے۔ چنانچہ امر واقعہ یہ ہے کہ جذبہ محبت کی اگر مناسب آبیاری کی جائے اور اس کے تقاضوں کو مسلسل کما حقہ پورا کیا جائے تو اس میں ضرور اضافہ ہوتا ہے اور اس کی شدت و قوت دوچند ہو جاتی ہے، لہٰذا آیت قرآنیہ: **وَيَزِيدُ اللَّهُ الَّذِينَ اهْتَدَوْا هُدًى ط**

(مريم: ۷۶)

ترجمہ: جو لوگ راہِ راست پر ہیں اللہ ان کو (روز بروز) زیادہ ہدایت دیتا چلا جاتا ہے۔

وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِتْنًا لَّنَحْمِلْهُمْ سَبْتًا

(المنکبوت: ۶۹)

ترجمہ: اور جو لوگ ہماری رد میں مشقتیں برداشت کرتے ہیں ہم ضرور انہیں اپنے رست دکھائیں گے۔

لَهُمْ فِتْنَةٌ أَمْؤُوا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنَاهُمْ هُدًى ۝

(الکصف: ۱۳)

ترجمہ: وہ چن کر جو ان سبقتے جو اپنے رب پر ایمان لے آئے تھے اور ہم نے ان کو ہدایت میں ترقی بخشی تھی۔

گناہ کی حقیقت

(۱) اسباب گناہ: ایک مسلمان سے لغزش یا غلطی کا صدور صرف اس وقت ہوتا ہے جب وقتی طور پر اس کا ذوق حسن صحیح نصب العین سے مخالف سمت میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ اور یہ اسی وقت ہوتا ہے جب کوئی خیال فاسد اسے اپنی جانب متوجہ کر کے جذبہ محبت کی غلط سمت میں راہنمائی کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ عمل صحیح نصب العین کی بجائے کسی باطل نصب العین کی مقصد براری کرتا ہے۔ چنانچہ ایک غلطی یا سیاہ کاری دوسری غلطیوں کے لیے راہ ہموار کر دیتی ہے۔ کوئی باطل یا فاسد خیال ایک ضعیف الاعتقاد شخص کے دل میں یقین پیدا کر دیتا ہے کہ اگر وہ اس کام کو انجام دے لے تو اسے مسرت حاصل ہوگی یا کسی عارضی رنج و الم سے چھٹکارا ہو جائے گا۔ حالانکہ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اس عمل کے تقاضے اس کے حسن مطلق کے ساتھ رشتہ محبت کے تقاضوں اور مطالبوں کے خلاف اور متضاد ہیں چنانچہ اصل مسئلہ اس کی اپنی خودی اور اس کے استحکام کا ہے۔ اگر اس میں بچھگی نہیں ہے تو وہ حقیقی محبوب اور اس کی محبت کو پس پشت ڈال کر اس عارضی آرام یا مسرت کو ترجیح دے دیتا ہے۔ بالفاظ دیگر وہ اس لمحے کے لیے حقیقی ایمان اور محبت الہی سے تہی دامن ہو جاتا ہے اور اس سے غلط اعمال کا صدور ہوتا ہے۔

(ب) گناہ کا خودی پر اثر: جب باطل خیال اور اس کے زیر اثر باطل عمل وقوع پذیر ہو جاتا ہے اور اس کی عارضی لذت ختم ہو جاتی ہے تو ایک صحیح الاعتقاد مسلمان اس لغزش و در نیان کے بعد دوبارہ اپنے محبوب حقیقی کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ لیکن وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کی یہ محبت کمزور پڑ گئی ہے اور شیطانی افعال و خیالات کے ساتھ اس کا رشتہ مضبوط ہو رہا ہے فطرت کا اٹل قانون ہے کہ جیسے خیالات ذہن انسانی میں گھر کیے رہیں گے اور جس قسم کے افعال کا ظہور اس کے اعضاء و جوارح سے ہوگا، ان کا ایک گہرا اثر اس کے قلب و ذہن پر پڑے گا۔ یہ حقیقت نیک افعال کے بارے میں بھی اتنی درست ہے جتنی افعال شنیعہ کے بارے میں۔ چنانچہ امر واقعہ یہ ہے کہ کوئی فعل خواہ وہ کتنا ہی حقیر ہو، انسانی خودی کے لیے انتہائی اہمیت کا حامل ہے اور اس کی تعمیر یا تخریب کا کام کرتا ہے۔

گناہ سے بچنے کا طریقہ

ایک غلط خیال پہلے پہل انسان کی قوت تخیل پر اثر انداز ہوتا ہے اور بعد ازاں اس کے قوائے عمل پر گرفت حاصل کرتا ہے۔ جو نہی یہ ذہن میں داخل ہوتا ہے اسی لمحے وہ اس محبت پر نقب زنی کرتا ہے جو صحیح نصب العین کے لیے مختص ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ یہ خیال اتنا قوی ہو جاتا ہے کہ وہ انسان سے عمل بد کروانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ہونا یہ چاہیے کہ خیال فاسد کو ذہن میں آنے کے بعد فوراً ہی دیا جائے۔ کیونکہ دیر تک غلط سوچ کا ذہن پر مستولی ہونے کا نتیجہ عمل بد کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے، غلط سوچ اور فکر ہی ہمیشہ غلط کام کا پیش خیمہ ہوتا ہے جس کو شیطانی و سو سے کے تحت کچھ وقت کے لیے ذہن میں گل کھیلنے کا موقع دے دیا جاتا ہے۔ اگر فکر بد کو تخیل کی سطح پر فوری طور پر ختم نہ کیا جائے یہ لازماً عمل بد پر منتج ہوتا ہے چنانچہ ایک مومن صادق کے خیال میں جو نہی کوئی شیطانی و سو سے آتا ہے وہ فوراً متوجہ ہو کر شعوری طور پر اسے اپنے ذہن و قلب سے نکال باہر کرتا ہے کیونکہ وہ ایک پل بھر کے لیے بھی اللہ تعالیٰ کی ناراضگی مول نہیں لینا چاہتا۔ ان مومنین صادقین کی یہ شان قرآن کریم نے اس طرح بیان کی ہے:

إِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ طَائِفٌ مِّنَ الشَّيْطَانِ تَذَكَّرُوا فَإِذَا هُمْ مُبْصِرُونَ ۝ (الاعراف: ۲۰۱)

ترجمہ: حقیقت میں جو لوگ متقی ہیں، اُن کا حال تو یہ ہوتا ہے کہ کبھی شیطان کے شرے کوئی بُرا خیال اگر نہیں چھو بھی جاتا ہے تو وہ فوراً چوکتے ہو جاتے ہیں۔ اور پھر انہیں صاف نظر آنے لگتا ہے (کہ ان کے لیے صحیح طریق کار کیا ہے)

غلط خواہش نفس سے بچنے کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کی اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت بڑھ جاتی ہے اور وہ اس دنیا میں بھی خوف و حزن سے محفوظ رہتا ہے اور آخرت میں جنتِ نعیم کا حقدار بنتا ہے۔ جب تک انسان کے ذہن و قلب کے کسی گوشے میں باطل نظریے کے ساتھ تعلق کا کوئی شائبہ پایا جاتا ہے، خواہ اس نے ابھی عمل اس باطل نظریے کے مطابق نہ کیا ہو، وہ حقیقی معنوں میں مومن صادق اور محبت صادق نہیں ہے۔ جیسا کہ ایک حدیث نبویؐ میں آیا ہے، اس میں ایمان رانی کے دانے کے برابر بھی نہیں رہتا۔

گناہ انسان کی فطرتِ سلیم کے خلاف عمل ہے جو انسانی خودی کے ارتقاء اور ترقی کے عمل میں منفی کردار ادا کرتا ہے۔ یہ انسان کے باطن کی قلبِ ماہیت کو اس کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ کھڑی کر دیتا ہے۔ اس کو ہٹائے بغیر کوئی مسلمان روحانی ترقی حاصل نہیں کر سکتا۔

گناہ کے بُرے عواقب سے بچنے کا طریقہ: بطہ نفس

گناہ کے بُرے عواقب اور اثرات سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ انسان مصیبت کے ارتکاب کے فوراً بعد خود احتسابی کرے اور یہ دیکھے کہ وہ کون سی ذہنی کیفیت اور حالت تھی جس کی وجہ سے مصیبت کا ارتکاب ہوا۔ اسے اس بات کی از حد پشیمانی ہونی چاہیے کہ وہ جن نفسانی خواہشات کا غلام بن گیا تھا وہ انتہائی گھناؤنی اور قابلِ مذمت تھیں۔ جتنی گہری یہ پشیمانی ہوگی اتنا ہی اس بات کا امکان کم ہوگا کہ وہ دوبارہ اس گناہ کو دہرائے۔ اس مقصد کے لیے یہ بھی از بس ضروری ہے کہ وہ جن ازلی پر دوبارہ بھرپور طریقے پر ازکا زتوجہ کرے تاکہ اس تعلق قلبی میں جو کمی واقع ہو گئی تھی وہ پوری ہو جائے۔ جو جہی وہ مصیبت اور اس کے غلط اثرات کو

اپنے ذہن و قلب سے دھونیتا ہے۔ پھر انابت الی اللہ کے مراحل طے کرنے لگتا ہے۔ یہ تطہیری عمل جس کے ذریعے ایک عاصی انسان اپنے نفس کو پاک کرتا ہے توبہ یا رجوع الی اللہ کہلاتا ہے بطور ذہنی عمل رجوع یا توبہ کے چار اجزاء ہیں :

۱۔ غلطی اور معصیت کا اعتراف یعنی یہ احساس کہ جو کچھ اس نے چاہا یا کیا وہ انتہائی قبیح تھا۔ اس کے ساتھ ہی اسے تہہ دل سے اپنے کیے پر ندامت اور پشیمانی ہونا ضروری ہے۔

وَاٰخِرُوْنَ اَعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا
عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرًا سَيِّئًا ط (التوبة : ۱۰۲)

ترجمہ : ”اور کچھ دوسرے لوگ ہیں جنہوں نے اپنے قصوروں کا اعتراف کر لیا ہے ان کا عمل مخلوط ہے، کچھ نیک ہے اور کچھ بد“

۲۔ خیال اور عمل دونوں کی سطح پر اس معصیت کو انجام نہ دینے کا عزم مصمم :
يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا تَوْبُوا إِلَى اللَّهِ تَوْبَةً نَّصُوحًا (التحريم : ۸)

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ کے حضور میں توبہ کرو، خاص توبہ“

۳۔ معرفت الہی اور حب الہی کو دوبارہ حاصل کرنے کی بھرپور کوشش اور اس کے لیے اخلاقی اصلاح کی حتی المقدور سعی۔

فَمَنْ أَمَنَ وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ
وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (الانعام : ۴۸)

”پھر جو کوئی ایمان لایا اور اس نے (اپنے عروج کی) اصلاح کرنی تو ایسے

لوگوں کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے“

۴۔ خالق حقیقی کی صفات حسنہ پر تجدید ایمان اور اس حقیقت کا یقین کہ اس کا مربی اور اس کی خودی کو بالیدگی اور نشو و نما دینے والا سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی اور نہیں ہے۔ چنانچہ وہ اسی تلے مغرور و دگرگزر کا خواستگار ہوتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اسی کی خوشنودی اور رضا کے ساتھ حقیقی روحانی ترقی حاصل کر سکتا ہے۔

وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسًا نَّفْسَهٗ نَعَزَّ نِيْثًا شَقِيْرًا

يَجِدُ اللّٰهَ عَفُوًّا رَحِيْمًا ۝ (النساء : ۱۱۰)

ترجمہ: اور جو شخص کوئی بُر کام کرے یا اپنی جان پر ظلم کرے پھر اللہ سے مغفرت

طلب کرے تو وہ اللہ کو بُر مغفرت والا (اور) بزرگم کرنے والے سے بڑا ہے۔

توبہ کے محول بالا ذہنی لوازم اُس وقت بطریق احسن پورے ہوتے ہیں جب ایک بندہ عاصی تہہ دل سے قرآن میں سکھائی گئی یہ دعائیں پڑھتا ہے اور ان کے ایک ایک لفظ کا گہرا شعور حاصل کرتا ہے:

رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا

لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝ (الاعراف : ۲۳)

”اے رب ہمارے اہم نے اپنی جانوں پر بڑا ظلم کیا اور اگر تو نے ہم سے درگزر

نہ فرمایا اور رحم نہ کیا تو یقیناً ہم خسارہ پانے والوں میں ہو جائیں گے۔“

لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ (الانبیاء : ۸۷)

”خدا یا! تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔ پاک ہے تیری ذات بنے شک میں ہی قصور دار ہوں۔“

نفس اور روح کی ممکن تفسیر اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک انسان اُن تمام

خواہشات، تمناؤں اور افعال سے اجتناب نہیں کرتا جو اس کی فطرتِ سلیمہ کے خلاف ہیں

اور ہر طرف سے منہ موڑ کر اس حسن ازلی کی طرف رُخ نہیں کر لیتا جس کی عبادت و محبت کی

خواہش اس کے وجود کی گہرائیوں سے پیھوٹ رہی ہے۔

وَبَشِّرِ الصّٰلِحِيْنَ الَّذِيْنَ اٰتٰوْا مَالَهُمْ ذِكْرًا لِّتُنْفِقُوْا مِنْهُ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۝ (المزمل : ۸)

ترجمہ: اور سب سے کٹ کر اُسی کے ہو رہو۔

معصیت پر تہہ دل سے مذمت و پشیمانی اور خدا کے حضور گریہ و آہ و زاری کے ذریعے

ایک سیاہ کار اپنے رب کے بے پایاں فضل سے اس قابل ہوتا ہے کہ وہ حق تعالیٰ کے ساتھ

اپنا ٹوٹا ہوا ایمانی رشتہ دوبارہ استوار کر سکے۔ اور اسی طرح اس کی خودی دوبارہ مستحکم ہو کر شیطانی وسوسوں

کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ مناجات اور تسبیح کے ساتھ خدا کے حضور دعائیں مانگنے کے لیے رت

کا آخری حصہ بالخصوص مفید ہے۔ کیونکہ اس وقت دن کی مشغولیات سے توجہ نہیں ملتی اور انسان